عامر سہیل
شعبہ اردو، ایبٹ آباد پبلک سکول اینڈ کالج
مانسہرہ روڈ، ایبٹ آباد

ادبی تھیوری اور جدید اُردو تنقید کا منظر نامہ

The present literary scenario of Urdu criticism introduces so many new literary approaches and disciplines in the modern era of globalization. All these approaches carry their social and cultural perspectives which provide help to understand these prevalent phenomena. Besides Structralism, Post structuralism ,Modernism, Postmodernism, Deconstruction and Feminism there is also a Literary Theory, which provides us a special and new way to understand a piece of literature in which the reader plays a very important role to recreate the text and generate new meanings at his own. Such type of Reader Response Theory totally ignores the author and has no concern with the cultural perspective of that text. It looks that this theory creates new dynamics in criticism but practically its misleading approach, especially, in our eastern perspective. All literary interpretations draw on a basis in theory but can serve as a justification for very different kinds of critical activity. In the present essay, I discussed at length its fall out in Urdu language and literature.

ادب کی تفہیم ،تعبیر،تشریح اور تحلیل کے ضمن میں ادبی تھیوری کا ذکر جس شد و مد کے ساتھ کیا جا رہا ہے اُس کی وجہ سے کچھ ایسے مغالطے بھی جنم لے رہے ہیں جن پر سوچنا ضروری ہے۔ادبی تھیوری کا پس منظری مطالعہ ہمیں یہ تاریخی اشارہ مہیا کرتا ہے کہ اس فکر کا باضابطہ آغاز ارسطو کی ''بوطیقا'' سے ہوا تھا۔ارسطو اپنے عہد کے مروجہ سماجی اور سائنسی علوم وفنون کا منتہی تھا لیکن ادبی شعریات کی تھیوری مرتب کرتے وقت اُس نے صرف اعلیٰ ادبی فن پاروں کی روشنی میں اپنے تنقیدی افکار ونظریات وضع کیے۔''بوطیقا'' ایک خالص ادبی دستاویز ہے جس میں ادب کے علاوہ کسی اور علم یا فن کا سہارا لینے کا رجحان نہیں ملتا بلکہ ادبی فن پاروں سے ایسے عمومی اُصولوں کا استخراج کیا گیا ہے جن کی مدد سے جہاں ایک طرف ادب فہمی (جس میں تشکیل معنی،تعبیر معنی اور تشکیل حقیقت جیسے عناصر کسی نہ کسی صورت فعال نظر آتے ہیں) کے نئے در وا ہوئے وہاں اِن اُصولوں کا اطلاق ادبی دنیا میں وسعت کا باعث بھی بنا ہے ۔ادبی تھیوری کی اسی روایت کو لانجائنس،فلپ سڈنی ، ڈرائیڈن ،شیلے،میتھیو آرنلڈ،ایلیٹ اور ہمارے ہاں الطاف حسین حالؔی،امداد امام اثر،حامد اللہ افسراوراختر اورینوی نے آگے بڑھایا۔ اگر تنقیدی شعور کی اس معروضی روش میں اُردو اور فارسی کے کلاسیکی اساتذہ کرام کے اپنے مجموعوں پر لکھے گئے دیباچوں اور مقدموں کو بھی شامل کر لیا جائے تو ہمارے ہاں ادبی تھیوری کے خدوخال خاصے منضبط شکل میں جمع ہو

سکتے ہیں۔اس خصوص میں فائز دہلوی کا ذکر اس لیے ضروری ہے کہ اُنھوں نے اپنے مجموعوں کے آغاز میں شعری تعبیرات کے حوالے سے جو مباحث اُٹھائے اُن میں ادبی تھیوری کے نقوش موجود ہیں۔مشرقی معیارِ نقد کی ایک عمدہ مثال مولوی نجم الغنی رامپوری کی ''بحر الفصاحت'' ہے۔اس کتاب کا حصہ چہارم جو علم معانی سے تعارض کرتا ہے وہاں کچھ ایسے مباحث بھی مل جاتے ہیں جنھیں بہت بعد میں ''ساختیات'' کا نام دیا گیا تھا۔عربی ،فارسی اور اُردو کے کلاسیکی عہد میں تخلیقی ادب کے ہمراہ جس تنقیدی شعور نے جنم لیا اُس سے آگاہی حاصل کرنا اب بہت ضروری ہے،کیوں کہ اسی لاعلمی کی وجہ سے کچھ مغرب پسند نقاد اُردو تنقید کے بارے میں یہی کہتے ہیں کہ ''اس میں ردیف قافیے کی بحثوں کے علاوہ اور کچھ نہیں''۔جاحظ ، ابن رشیق ،قدامہ ابن جعفر،شمس قیس رازی کی تنقیدی بصیرت تک تو شاید کم کم لوگ پہنچ پائیں گے ابھی اُردو میں موجود ہ تنقیدی سرمایہ بھی ہماری خاص توجہ کا محتاج ہے جو قدیم رسائل،خطوط،معاصرانہ چشمک،اصلاح سخن کی روایت،اور ادبی معرکوں کے حوالے سے وجود پذیر ہوا۔تنقیدی منظومات کا ایک ذخیرہ الگ توجہ کا متقاضی ہے،جسے منظوم تنقید کہنا زیادہ مناسب ہے۔اس تمام بکھرے سرمائے میں مشرق کی اپنی ادبی تھیوری کے بنیادی مباحث کا کھوج لگایا جاسکتا ہے ۔تنقید کے ان دستیاب اور نظر انداز شدہ مآخذ میں تھیوری کی فلسفیانہ اور لسانیاتی سطحیں ادب کو ادب ہی بنا کر پیش کرتی ہیں اسے دیگر علوم وفنون کا حاشیہ بردار نہیں بنانے پر اصرار نہیں کرتیں۔

ساٹھ کی دہائی میں اسی ادبی تھیوری کو فرانس، جرمنی،روس اور انگریزی ممالک کے چند جید حکما وفضلا نے لسانیات ،بشریات،عمرانیات ،فنون لطیفہ اور کسی حد تک سائنسی علوم کے زیرِ سایہ پروان چڑھانے کا ڈول ڈالا۔اب ہوا یہ کہ مذکورہ علمی میدانوں میں جو نظریات مرتب شکل میں سامنے آ چکے تھے اُن سب کا اطلاق براہِ راست ادب پر بھی کیا جانے لگا اور رفتہ رفتہ ادب دوسرے علوم وفنون کے پہلو بہ پہلو دکھائی دینا شروع ہو گیا۔یہ بظاہر ایک بہت بڑا انقلاب نظر آتا ہے لیکن اس کے مضمرات پر ابھی تک ہماری (زیادہ تر اُردو نقادوں کی) نظر نہیں پڑی۔

سماجی علوم (ادب کے علاوہ) میں جو نظریات سامنے آئے اُس کی بدولت اِن علوم میں خاصی پیش رفت بھی ہوئی اور یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ یہ تمام نظریات اپنے اپنے محدود ڈسپلن کے اندر رہ کر ہی کار آمد ثابت ہوتے ہیں کیوں کہ یہ سب علمی کاوشیں اپنی مخصوص حدود ، نوعیت اور افادہ کی پیداوار ہیں۔ان نظریات سے حاصل شدہ علم خالص ادب کی سرحدوں سے ٹکراتا ضرور ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم ادب کی تفہیم میں بھی ان کی اجارہ داری قبول کر لیں اور ان کے حدود نا آشنا اطلاقات اور مطالبات کو حتمی تسلیم کر لیں۔ادب کی راست تفہیم میں ان نظریات پر انحصار کرنا نہ صرف ادبی حدود وثغور سے تجاوز کرنا ہے بلکہ ادب فہمی کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرنے کے مترادف ہے۔

اس وقت اُردو ادب میں جدیدیت،مابعد جدیدیت،ساختیات، پس ساختیات، ردِ ساختیات ،تانیثیت ،نوآبادیات ،مابعد نوآبادیات اور گئے تھیوری(Gay Theory) کے گرما گرم موضوعات اپنے خاص خاص مقاصد اور تناظرات کے ساتھ زیر بحث ہیں۔اور تماشا یہ ہے کہ ادب کی ہر تخلیق کو اب انھی دستیاب اصطلاحات کے سانچوں میں فٹ کر کے تجزیہ و تحلیل کے مراحل سے گزارا جاتا ہے۔جدید ادبی تنقید نے ایک اچھے بھلے فن پارے کو دال(signifier) اور

مدلول(signified) جیسی خشک اور بدمزہ اصطلاحات کے تابع کر دیا ہے۔اُردو زبان میں اس وقت تک جتنے نئے تنقیدی مباحث داخل ہو چکے ہیں اگر اُنھیں درست مان کر ادب کا تجزیہ کیا جائے تو اس کی وجہ سے خالص ادب کی شناخت قریب قریب مسخ ہو جاتی ہے۔مستزاد یہ کہ ادبی تھیوری نے دیگر سماجی علوم وفنون کو ادب پر حاوی کرنے کے بعد ''بین المتونیت'' (Inter Texuality) کا جو حربہ استعمال کیا اُس نے ادب کی باقی بچ جانے والی ادبیت کو بھی دھندلا دیا ہے۔ساختیات،جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے تمام مباحث چند گنی چنی اصطلاحات کی مالا جپتے ہیں۔دال و مدلول کا ذکر تو پہلے ہو چکا ہے اُسی شجرے کی توسیع میں اُفقی،عمودی،رسمیات،ضابطہ،مصنف یا محرر،نشان،یک زمانیت، ارتقائیت، لوگومرکزیت، بیانیہ اورمہابیانیہ یا پھر پیراڈائیم کا تانا بانا بھی شامل ہے۔جو ادب پارہ ان اصطلاحات کی گھمیری سے نکلے گا اُس کا حال ''ہر چہ درکان نمک رفت ،نمک شد'' سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہوگا۔

ڈاکٹر امجد طفیل اپنے مضمون ''تھیوری اور ادبی تھیوریز۔۔پرانی مصنوعات نئے لیبل'' میں لکھتے ہیں:

> ''ادبی نظریے کی بحث میں کچھ ایسی نئی بات نہیں ہے۔تو پھر نیا کیا ہے ؟ چند بھاری بھرکم الفاظ اور اصطلاحات،کیا صرف نئے الفاظ اور نئی اصطلاحات لکھ دینے سے تصورات نئے ہو جاتے ہیں؟''(۱)

ادبی تھیوری کے مسلمات اور طریق کار پر توجہ کریں تو اس میں میکانکی اُصولوں پر مشتمل ایک جدول نظر آئے گی۔یہ جدول جہاں ادب پارے کے لوازم کو'' قبل معنی'' اور'' مابعد معنی'' کے مراحل میں منقسم کرتی ہے وہاں یہ مغالطہ بھی عام کرتی ہے کہ ادبی تھیوری اپنی اصل کے اعتبار سے اقداری نہیں بلکہ معروضی اُصولوں کا مجموعہ ہے؛یہ مجموعہ جسے مجموعہ ء اضداد کہنا زیادہ مناسب رہے گا اس میں فن پارے کے موضوع اور سلسلہ ء معانی سے کوئی غرض نہیں رکھی جاتی گویا فن پارہ کسی جیتے جاگتے انسان کی تخلیق نہیں بلکہ اسے کسی روبوٹ نے فکسڈ پروگرام کے تحت تشکیل دیا ہے۔

ادبی تھیوری کے کچھ تناقضات اور تضادات پر نظر کرنا ضروری ہے،مثلاً ادبی تھیوری نے روایتی تنقید کو محض اس لیے رد کیا کہ یہاں پہلے سے طے شدہ عقائد ونظریات کے تحت فن پارے کی جانچ پرکھ کی جاتی ہے اور چند متعین تنقیدی اُصولوں کو بروئے کارلانے کا رجحان عام ہے۔اول تو یہ الزام غلط ہے اور اگر اسے ٹھیک بھی مان لیا جائے تو خود ادبی تھیوری پر یہی الزام بآسانی عائد ہوتا ہے،کیوں کہ اس میں بھی پہلے سے طے شدہ میکانکی اُصولوں کو اساس مان کر فن پارے کی پڑھت اور تعبیر وتفہیم کا فریضہ ادا کیا جاتا ہے۔روایتی تنقید کے بارے میں تھیوری پسند ناقدین کی رائے یک طرفہ اور بڑی حد تک لاعلمی پر مبنی ہے۔حقیقت تو یہی ہے کہ روایتی تنقید (تذکروں کی تنقید کو چھوڑ کر) نے فن پارے کی تفہیم وتحسین کے لیے کبھی کسی میکانکی عمل کی پابندی نہیں کی۔حالؔی سے لے کر بہت بعد تک ہمارے نقاد کسی بھی تخلیقی فن پارے کو اپنی ذات میں ایک خود مکتفی شئے متصور کرتے چلے آئے ہیں یہی وجہ ہے کہ غالبؔ اور میرؔ جیسے تخلیق کار جدید تنقیدی پیراڈایم نہ ہونے کے باوجود عالمی سطح پر اپنی اہمیت منوانے میں کامیاب رہے ہیں۔اگر یہی میرؔ و غالبؔ تنقید کے اُسی ابتدائی دور میں'' تھیوری'' والوں کے ہاتھ لگ جاتے تو آج ان کا ذکر بھی دبستانِ دلی کے غیر معروف شعرا تک محدود رہتا۔آخر روایتی تنقید میں اتنی توانائی اور سکت موجود تھی کہ جس نے تنِ تنہا صدیوں تک عظیم فن پاروں کی تحسین شناسی اور

بقا کا اہم فریضہ ذمہ داری سے ادا کیا اور آج ہم اُن کے مطالعے سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ ایک لمحے کے لیے اگر یہ سوچ لیا جائے کہ کوئی بھی فن پارہ اپنی ذات میں اس خود مکتفی ہے اور قاری اُس کے تعبیراتی عمل میں یکسر آزاد و خود مختار ہوتا ہے۔ یہ اسی خود مختار فعالیت کا کرشمہ ہے کہ وہ فن پارہ صدیوں تک نو بہ نو تشریحی معروضات سے گذرتا چلا جاتا ہے اور اس بتِ ہزار شیوہ کی کیفیات بدلتی چلی جاتی ہیں اور نتیجے کے طور پر تعبیرات کا ایک غیر مختتم سلسلہ از خود وجود پذیر ہو جاتا ہے۔ تعبیرات کا یہ سلسلہ اپنے اثبات کے لیے اول تو کسی ''ادبی تھیوری'' کا پابند نہیں ہوتا اور اگر ضرورت پڑ بھی جائے تو یہ ادبی تھیوری اُسی سماجی اور ثقافتی تناظرات سے پھوٹے گی جہاں سے ادب کا دھارا پھوٹا تھا۔ اُردو تنقید سے متصل ادبی تھیوری میں یہ فطری ارتقا اپنی تمام تر رعنائیوں اور پنہائیوں کے ساتھ فعال رہا ہے۔ ادب کا ہر قاری اپنی ذات میں ایک میشل فوکو اور لیوی سٹراس ہے بلکہ اُن سے بڑھ کر ادبی فن پاروں سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ اردو کے جدید نقادوں نے اپنی تحریروں میں ''قاری'' کی اہمیت اور فضیلت پر اتنا زور دیا کہ اسے ادب کا مالک و مختار تسلیم کر لیا گیا ہے۔ کیا کوئی جانتا ہے کہ یہ ''قاری'' اصل میں کون ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ'' قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے نقاد'' ۔ ادبی تھیوری کے بھیس میں جس ''قاری'' سے ہم ملتے ہیں وہ اصل میں ایک جدید پیشہ ور نقاد ہے۔ اس کا صدف بھی گوہر سے خالی ہے اور ہیں طلسم اس کے سب خیالی۔

اُردو کی روایتی تنقید کو رد کرنے سے کسی جدیدیت کا بھلا نہیں ہوسکتا۔ ماضی قریب میں محمد حسن عسکری اور سلیم احمد کی ادھوری جدیدیت نے ادب کو کیا دیا ؟ موجودہ عہد میں جدیدیت کا پرچار ایک بار پھر اُردو ادب کو ایک ایسے موڑ پر لا کھڑا کرے گا جہاں اس کی شناخت کا ایسا بحران پیدا ہوگا جس سے نکلنا محال ہوسکتا ہے۔

یہ بات ادب کا ایک ادنیٰ قاری بھی جانتا ہے مغرب میں جنم لینے والی ہر فکر اور تحریک اپنا ایک تاریخی جواز اور ارتقائی حوالہ رکھتی ہے۔ وہاں کے ماحول میں کوئی فکر راتوں رات پیدا ہو کر سماج میں انتشار کا باعث نہیں بنتی اس لیے وہاں علمی مکالمے کی فضا ہر وقت قائم رہتی ہے۔ اس کے برعکس ہمارے ہاں کوئی بھی نئی فکر اچانک اپنی موجودگی کا اعلان کر دیتی ہے جو بدقسمتی سے اپنے تناظرات سے پوری طرح منقطع ہوتی ہے لیکن اُس پر گرما گرم بحث کا سلسلہ اس طرح شروع ہو جاتا ہے گویا وہ فکر ایک عرصے سے ہماری روز مرہ زندگی کا ناگزیر حصہ رہی ہے۔ اس نوع کے مکالمے فکری انتشار پیدا کرتے ہیں۔ یہاں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا جدید تنقیدی نظریات مع ادبی تھیوری اُردو زبان و ادب میں پہلے سے موجود تصورات کو بیک قلم مسترد کر کے اپنی جگہ بنائیں گے؟ کیوں کہ بقول مشتاق صدف:

''نئی تھیوری ضابطوں اور کسی سکہ بند نظام کو قبول نہیں کرتی بلکہ معنی کے جبر کو توڑتی ہے۔'' (۲)

تو کیا نئی ادبی تھیوری کے معنی یہ سمجھیں جائیں کہ وہ اُردو ادب سے وابستہ تمام تہذیبی اور ثقافتی اقدار اور تناظرات کو کچلتے ہوئے اپنی جگہ بنائے گی؟ کیا نئی ادبی تھیوری پرانی تھیوریز کے ساتھ مفاہمت کی کوئی راہ نکال پائے گی یا اپنی طے شدہ شرائط منوانے میں کامیاب ہو جائے گی ؟ اس طرح کے بے شمار خدشات اُردو والوں کے دلوں میں موجود ہیں جن کا کوئی منطقی اور تشفی بخش جواب آنا ابھی باقی ہے۔ ستم بالائے یہ بھی ہے کہ اُردو ادب میں ایک گروہ ایسا بھی موجود ہے جو

آئے دن اس نئی تھیوری کے حق میں مضامین ،مقالات اور کتابیں تصنیف کرنے میں مصروف ہے۔ گویا انھوں نے اپنے طور پر یہ طے کر لیا ہے کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے اب اُردو ادب میں اس نئی تھیوری کو شامل کر کے ہی دم لینا ہے۔ یہ تحریریں بذات خود کیا اہمیت رکھتی ہیں اس کے بارے میں ڈاکٹر امجد طفیل کی رائے ملاحظہ ہو، وہ کہتے ہیں:

'' اس نوعیت کے جتنے مضامین میری نظر سے گزرے ہیں،اُن سب کی مشترک خصوصیات یہ ہیں کہ لکھنے والے نئے نئے الفاظ کے پیچھے بھاگتے ہیں اور رُک کر خیال پر غور کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ بیشتر حالتوں میں جن معاصر مغربی دانشوروں کا حوالہ دیتے ہیں اُن کے اصل کام سے واقفیت حاصل کرنے کے بجائے تشریحی انداز میں لکھی گئی کتابوں پر بھروسا کرتے ہیں۔۔۔بنیادی بات یہ ہے کہ وہ جس دانشور کے بارے میں بات کر رہے ہوتے ہیں اُس سے دانش وری کی وہ طرز جنم لیتی ہے جسے '' مستعار دانشوری'' بھی نہیں کہا جا سکتا کیوں کہ اس بات کا تعین دشوار ہے کہ یہ کس سے مستعار لی جا رہی ہے۔'' (۳)

مقامِ تعجب ہے کہ آخر اُردو زبان و ادب پر ایسی کون سی آزمائش آن پڑی ہے کہ ادبی تھیوری کو بزورِ شمشیر مسلط کرنے کی نوبت آ گئی ہے۔ اورایک ایسی تھیوری جس پر ابھی مغرب میں بھی کوئی واضح لائحہ عمل طے نہیں ہوا اُسے کیوں ہنگامی بنیادوں پر لاگو کرنے کے جتن کیے جا رہے ہیں!!!

میرے اُٹھائے گئے ان سوالوں کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ اُردو والوں کو ہر جدید فکر یا نظریے سے دور رہنا چاہیے۔مدعا صرف اس قدر ہے کہ اُردو ادب میں جدید فکری رویوں کے جذب و قبول کا عمل ہمیشہ ایک فطری بہاؤ کے ساتھ جاری رہا ہے اور جو شئے اُردو کے مزاج سے ہم آہنگ تھی وہ از خود اس کا حصہ بنتی چلی گئی اور اُسے منوانے کے لیے کسی خارجی سہارے کی ضرورت نہیں پڑی۔عالمی سطح پر دیکھا جائے تو ادبی تھیوری کوئی ایسا عجوبہ نظر نہیں آتی کہ جس کی وضاحت و صراحت کرنے کے ساتھ ساتھ اُس کے نفاذ کی کوشش بھی کی جاتی رہی ہو۔اُردو زبان و ادب میں جس طرح مارکسی،فرائیڈین،علامت پسندی اور ہیئت پسندی نے فطری ماحول میں رہتے ہوئے اپنی جگہ بنائی اسی طرح ادبی تھیوری میں اگر کوئی جان ہوئی تو وہ بھی ہمارے ادب کا جز بن جائے گی۔اس کے لیے ٹیمیں تشکیل دینے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ ادبی تھیوری اور دیگر جدید مغربی افکار ونظریات کی اُردو میں شمولیت کے اعتبار سے ہمارے کچھ ناقدین نے مفروضے بھی وضع کر رکھے ہیں جن کا محاکمہ ہونا چاہیے مثلاً ضمیر علی بدایونی کا کہنا ہے:

'' اب وہ زمانہ بیت گیا جب مشرق،مشرق تھا اور مغرب،مغرب، اب یہ دونوں ہی ایک ڈرامے کے دو کردار ہیں۔جو ایک کھیل میں الگ بھی ہیں اور شریک بھی دونوں ایک ہی Paradigm کے زیرِ اثر ہیں ان دونوں کرداروں کی یکجائی عالمی تمثیل کے تاثر میں اضافہ کر رہی ہے۔وجودیت،مظہریت،ساختیات۔ردِ تشکیل اور جدیدیت اور مابعد جدیدیت بدلتے ہوئے ثقافتی نمونوں کا ایک منظر نامہ پیش کرتے ہیں۔موجودہ عہد گزشتہ ساری ادبی اور فلسفیانہ تحریکوں کے نتیجے میں وجود میں آیا۔''(۴)

یہ مفروضہ صرف اُسی صورت میں قابلِ قبول ہوسکتا ہے جب یہ ثابت ہو جائے کہ ہمارے اُردو ادب کی قدامت

معاصر مغربی زبانوں کے برابر ہے۔یا پھر ایسا دعویٰ مغرب کی جانب سے ہو جس میں اُردو زبان و ادب کی فضیلت کو آزادانہ طور پر تسلیم کیا گیا ہو۔آخر ہم تمام مغربی علوم وفنون کو وحدت الوجود کے اُصول پر کیوں حل کرنا چاہتے ہیں!ہم یہ ماننے کے لیے تیار کیوں نہیں ہو سکتے کہ مشرق،مشرق ہے اور مغرب واقعی مغرب ہے۔ہمارے ناقدین اس طرح کے دعوے کچھ اس ادا اور اپنائیت سے کرتے ہیں گویا مغرب کی تمام جامعات میں بھی حالؔی ،شبلؔی،آزادؔ،محمد حسن عسکری اور ڈاکٹر وزیر آغا کے تنقیدی نظریات پڑھائے جا رہے ہیں،کیوں کہ اگر بقول ضمیر علی بدایونی :

'' اب وہ زمانہ بیت گیا جب مشرق،مشرق تھا اور مغرب،مغرب، اب یہ دونوں ہی ایک ڈرامے کے دو کردار ہیں۔''(۵)

پھر ہمارے تمام ادیب،شاعر اور نقاد مغرب والوں کے لیے اجنبی نہیں ہونے چاہیں۔کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ ہم مشرق والے مل کر کوئی ادبی تھیوری وضع کریں اور کچھ عرصے کے بعد سارا مغرب ہمارے فراہم کردہ تعقلات اور تناظرات کے مطابق اپنے فن پاروں کو پرکھنا شروع کر دے،اور پھر ہمارے موجودہ اُردو نقاد دیکھتے ہی دیکھتے جرمنی،امریکہ،فرانس اور برطانیہ کے نصابوں میں شامل ہو جائیں اور وہاں ہر ایک کی زبان پر الطاف حسین حالی،محمد حسن عسکری،شمس الرحمٰن فاروقی اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا ذکر چل پڑے،مغرب کی تمام جامعات میں '' مقدمہ شعرو شاعری'' پر عالمی سیمنارز منعقد ہو رہے ہوں۔۔۔کچھ لوگ میری اس بات کو مذاق سمجھیں گے لیکن ہمارے اُردو نقاد یہی مذاق عملی سطح پر ہمارے ادب کے ساتھ کر رہے ہیں۔ جدید تنقید کچھ ایسی بے برکت تنقید ہے کہ جس میں تخلیق اور تخلیق کار کے لیے کچھ نہیں۔ ہمارے اُردو نقادوں کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ابھی اِن سے یہی طے نہیں ہو رہا کہ ہم نے مغرب سے کیا لینا اور کیا ترک کرنا ہے۔

ہم سب جانتے ہیں کہ زمینی حقائق یکسر مختلف بلکہ متضاد صورتِ حال کی ترجمانی کرتے ہیں۔اس تمام بُعد و اختلاف کے بعد بھی ہمارے نقاد مغرب کی ہر تھیوری اور فکر کو اُردو زبان و ادب پر لادنے میں لگے ہوئے ہیں،اور اچھے بھلے فن پاروں کو ایسی جناتی اصطلاحات کے جال میں پھنساتے ہیں کہ فن پارہ اپنی بلاغت اور جمالیات کو بچاتے بچاتے پارہ پارہ ہو جاتا ہے۔اب کسی ادبی فن پارے کو ان نام نہاد جدید ڈسپلن کے حوالے سے پرکھنے اور پڑھنے کا مطلب یہ ہوا کہ ہم نے اصل متن کو فرضیوں کے انبار تلے ڈھیر کر دیا ہے اور دیگر علوم کو اس قدر حاوی کر دیا ہے کہ ادبی فن پارہ کہیں بیچ ہی میں دب کر دم توڑ دیتا ہے۔ ادبی فن پارے کی موت کو یقینی بنانے کے لیے ضروری تھا کہ مصنف کی موت کا اعلان پہلے کر دیا جائے تا کہ مادر پدر آزاد متن کو حسب منشا مروڑا توڑا جا سکے۔ادب کی اس تفہیمی کارروائی کو'' بین العلومیت'' کا تڑکا لگا دیا گیا تا کہ اس ادبی جائزے کو بھاری بھرکم اصطلاح میں چھپایا جا سکے۔اگر اسی کا نام ادبی تھیوری ہے تو پھر اسے دور سے سلام۔ ہمارے ہاں مغرب پرست نقادوں نے ادب کی حدود ااس قدر وسیع کر دی ہیں کہ اب اس میں باقی سب کچھ تو موجود ہے صرف ادب غائب ہے۔ اتنی بات تو ایک ادنیٰ قاری بھی جانتا ہے کہ کسی بھی سماجی یا سائنسی علم کو ختم کرنے کا آسان طریقہ یہی ہے کہ اس علم کی تعریف یا تو اتنی محدود کر دی جائے کہ اُس کی ممکنہ اصل صفات کا ذکر بھی کم کم

آنے پائے یا پھر اُس کی تعریفی حدود کو اتنا پھیلا دیا جائے کہ دیگر علوم بھی از خود اُس میں شامل نظر آئیں۔ ہمارے نقادوں نے دوسرے طریقے میں سہولت سمجھی اور اسے کامیابی سے آزما بھی ڈالا۔ ادبی تھیوری کے جید اور پیشہ ور نقادوں نے قاری کو آسانی مہیا کرنے کی خاطر ایسے ایسے رنگین شیشوں کے چشمے تیار کر لیے ہیں کہ اب ہر قاری اپنی پسند کا رنگین چشمہ پہن کر ادب کا بالاستعیاب مطالعہ کرتا ہے۔ جس کے پاس ہرے رنگ کا چشمہ ہوگا اسے ہر طرف ہرا دکھائی دے گا، اسی طرح زرد چشمے والے کو اچھا بھلا فن پارہ صرف زرد ہی نظر آئے گا۔

مغرب میں بلا شبہ تنقید نے خاصی ترقی کی لیکن وہاں نئے نظریات میں رد و قبول کا ارتقائی فطری عمل بھی جاری و ساری رہا ہے جس کے باعث ہر تازہ فکر اپنے ماضی، حال اور مستقبل سے پوری طرح منسلک نظر آتی ہے اور اپنا معقول جواز بھی رکھتی ہے۔ جب کہ ہمارے ہاں اندھی تقلید اصل مسئلے کو عجیب ماورائی دھند میں گم کر دیتی ہے۔ ہمارے ہاں ویسے بھی مغرب کے چبائے نوالوں کو رواج دینے کا فیشن عام ہے۔ اُردو میں ادبی تھیوری کے نام پر دیگر علوم کو فروغ دینے کا عمل جس تیزی سے جاری و ساری ہے اُسے دیکھ کر خوف آتا ہے کہ وہ دن دور نہیں جب ہمارا اُردو ادب محض دوسروں سماجی علوم کی حاشیہ برداری کا فریضہ ہی انجام دینے کے قابل رہ جائے گا۔ ہمیں یہ بات کبھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ ہر زندہ ادب مشترک انسانی اقدار کو موضوع بناتا ہے اور اس سے فیض یاب ہونے کے لیے لازمی ہے کہ مصنف کو زندہ سمجھا جائے اور اُس کے ارادی منشا کی قدر افزائی بھی کی جائے۔

ادبی تھیوری کے تانے بانے ساختیاتی مظاہر کی مدد سے بھی تیار کیے گئے تھے اور ان مظاہر کا سب سے مضحکہ خیز پہلو یہ تھا کہ متن کو ہی سب کچھ فرض کر کے مصنف کو نکال باہر کر دیا گیا۔ (یہ منفی رویہ آگے چل کر یہ تقاضا بھی کر سکتا ہے کہ ہر نئی آنے والی کتاب پر مصنف کا نام لکھنے کا تکلف بھی نہ کیا جائے) اس کے مطابق متن خود مختار اور خود مکتفی ہے جبکہ قاری کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جو چاہیے متن سے برآمد یا درآمد کرے۔ اس ادبی عقیدے نے من مانی اور من چاہی تشریحات و تعبیرات کا جو طومار لگایا اُسے دیکھ کر مصنف خود ورطۂ حیرت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ متن کو تمام تکلفات سے آزاد کرنا بھی ایک لایعنی عمل ہے۔ ادبی تھیوری کے مطابق ایک فن پارہ جب الفاظ کی ترتیب و تشکیل کے مراحل طے کر لیتا ہے تو اُس کے لیے یہ جاننا قطعاً ضروری نہیں ہوتا کہ مصنف نے اسے کس خیال کے تحت معرضِ وجود میں لایا تھا، اب متن کو سامنے رکھ کر عام قاری (نقاد) مراقبہ کرے گا اور پھر اس کا کشف جو بتائے گا وہی درست ہوگا۔ یہاں عمومی نوعیت کے کچھ سوال پیدا ہوتے ہیں۔ اگر کوئی فن پارہ اپنی ذات میں ایک کامل مفہوم رکھتا ہے تو کیا یہ مفہوم پیدا کرنے میں مصنف کا کوئی کردار نہیں؟ کیا کسی فن پارے میں جو ایک معنی موجود ہے یا کثیر معانی کے دریا بہہ رہے ہیں اب اُن میں مصنف کا کوئی حصہ نہیں بنتا؟ کیا ہم یہ فرض کر لیں کہ فن پارے سے جو معانی کشید کیے جا رہے ہیں وہ مصنف کے ذہن میں نہیں تھے اور نہ اُن تک وہ پہنچ سکتا تھا؟ کیا فن پارے میں موجود معانی کا سیل بے پناہ از خود پیدا ہوا ہے یا کوئی اور بھی اس کا ذمہ دار ہے؟ آخر یہ فرضیہ کیوں قائم کیا جائے کہ متن میں موجود معانی صرف قاری ہی کے ذہن میں آ سکتے ہیں اور وہی اس کا مکلّف ہے؟ مصنف کو اُس کی تصنیف سے بے دخل کر کے ہم ایسے کون سے ارفع مقاصد حاصل کر رہے ہیں جو اس سے قبل ممکن الحصول نہ تھے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہمارے جدید تنقیدی رویے بالآخر قاری کو بھی نکال باہر کر دینے کے بعد

متن ہی کو دیوتا سمجھ کر اُس کی پرستش شروع کر دیں۔ اس نوع کے مزید کئی سوال ادبی تھیوری کے جدید علم برداروں سے پوچھے جا سکتے ہیں۔ یہاں ایک بات اور بھی کہنے کی جسارت کروں گا کہ کسی خاص تہذیبی و ثقافتی تناظر میں جنم لینے والا نظریہ جہاں اُس خاص ملک کی فلاح و بہبود اور سماجی فکر میں مثبت کردار ادا کرتا ہے وہیں وہ نظریہ کسی دوسری ثقافت میں سمِ قاتل بن سکتا ہے۔ادبی تھیوری اور اس کے متعلقات اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ ہمارے ہاں اُردو ادب میں مغربی سماجی تحریکوں اور رویوں کو جس اہتمام کے ساتھ جوڑا توڑا جا رہا ہے اُس سے تو یہی متبادر ہوتا ہے کہ جیسے یہ سب کچھ اُردو ادب کے لیے بہت ضروری ہے اور اس کی بقا کا آخری حل بھی اسی میں پوشیدہ ہے اور اگر ان جدید آلات کی معاونت حاصل نہ کی گئی تو ہم سب اَن پڑھ اور جاہل بن کر رہ جائیں گے۔

ضمیر علی بدایونی کی جس کتاب (جدیدیت اور مابعد جدیدیت) کا اُوپر حوالہ دیا گیا ہے اُس پر ایک نہایت فکر انگیز تبصرہ انتظار حسین نے کیا تھا جو پہلے روزنامہ'' ڈان'' میں شایع ہوا اور بعد ازاں جناب بدایونی نے اُسے اپنی دوسری کتاب میں محض اس نیت سے شامل کیا تا کہ وہ اُن تمام اعتراضات کا جواب دے سکیں جو انتظار حسین نے اُن کی کتاب پر کیے تھے۔ ان اعتراضات پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے:

> '' ضمیر علی بدایونی کی عالمانہ کتاب'' جدیدیت اور مابعد جدیدت'' پر بات کرتے ہوئے میں نے کہا تھا کہ اس نئے ادبی نظریے کے رو برو ادیب حواس باختہ نظر آتا ہے۔۔وہ خود کو اس منظر نامے میں ٹاٹ باہر محسوس کرتا ہے۔تخلیق کو تو نرا متن سمجھا جاتا ہے جس میں تخلیق کار کا کوئی حوالہ نہیں ہوتا۔ایسا فلسفہ ادیبوں کو بھلا کس طور تحریک دے سکتا ہے اور کس طرح ادب میں نئے رجحانات کے لیے راہ ہموار کر سکتا ہے؟'' (۶)

انتظار حسین کے محسوس کردہ خدشات میں بڑا وزن ہے کیوں کہ ادبی تھیوری نے تخلیقات کی وضاحت اور صراحت کے جو معیارات متعارف کرائے اُن کی وجہ سے فن پارہ اب صرف متن پارہ بن کر رہ گیا ہے اس پر مستزاد یہ کہ تخلیق کار بذات اس سارے منظر نامے سے باہر جا پڑا ہے۔ اور تو اور قاری اساس تنقید کی شعبدہ بازیوں نے ادبی مسرت اور تخلیق کار کی فراست دونوں کو جلا کر بھسم کر دیا ہے۔ جدید ادبی تھیوری نے مصنف کے ارادی منشا سے انکار کر کے ہمارے بے شمار ادیبوں کی ادبی خدمات کو مشکوک بنا دینے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی ۔کلام اقبال میں سے اگر ہم ''مسجد قرطبہ'' اور '' طلوع اسلام'' کا مطالعہ قاری اساس تنقید کی روشنی میں کریں اور اس میں تخلیق کار کے ارادہ منشا کو پیچھے دھکیل کر اپنے ارادی منشا کو شامل کریں اور ہر نیا قاری ان نظموں کے ساتھ یہی سلوک روا رکھے تو بالآخر یہ متن اُس مقام پر پہنچ جائے گا جہاں نظموں کا یہ متن بے معنویت کا مرقع بن کر رہ جائے گا۔ ضمیر علی بدایونی جو کہ جدیدیت اور معابعد جدیدیت پر اچھی نظر رکھتے ہیں اُن کا کہنا ہے:

> '' موجودہ دور میں ادبی اور فلسفیانہ ڈسکورس کسی مخصوص معنویت کا پابند نہیں رہا۔افلاطون کے مکالمات کی ارادی معنویت مشکوک ہے۔ سقراط نے افلاطون کی شکل اختیار کی ہے یا افلاطون نے سقراط کو اپنے افکار کا ترجمان بنایا ہے۔ قدیم ویدوں کا خالق کون ہے اور الف لیلیٰ کی طلسمی داستانیں کس نے تحریر کی ہیں۔اس

کے علاوہ الحاقی ادب کی معنویت کا سر چشمہ کہاں تلاش کیا جائے۔جب مصنف ہی غائب ہے تو ارادی معنویت کا سراغ کہاں لگایا جائے۔'' (۷)

کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم ان جدید نظریات کو اُردو ادب میں متعارف کرانے کے چکروں میں مغربی تصورات کی بالا دستی بلکہ دہشت گردی کو اُردو سماج میں مستحکم کر رہے ہیں؟ان نظریات کا مطالعہ اُردو دان طبقے کے دل و دماغ پر کچھ اس خوب صورت انداز میں اپنا تسلط جما رہا ہے جس کے باعث مغربی قوت کا رعب اور خوف بالواسطہ یا بلا واسطہ ہماری نفسیاتی تربیت کا حصہ بنتا جا رہا ہے۔جدیدیت،ما بعد جدیدیت ،نوآبادیات اور مابعد نو آبادیات جیسے تصورات جب اُردو ادب میں وارد ہوئے تو ان کی دخل اندازی نے ہمارے اُردو ادب کو اتنا کچھ دیا نہیں جتنا کہ لے لیا ہے۔ مجھے ان تصورات کے علمی ہونے میں کوئی شبہ نہیں اور اس بات میں بھی کوئی شک نہیں کہ اُردو ادب میں ان کی آمد بعض سیاسی مقاصد بھی رکھتی ہے جس سے با خبر ہونا لازمی ہے۔ اس بات کو یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے قیام کا بڑا مقصد بظاہر اُردو اور دیگر زبانوں کی ترویج و اشاعت تھا لیکن درپردہ وہ ہندوستان پر اپنی گرفت مزید مضبوط کرنا چاہ رہے تھے اور تاریخ نے ثابت کیا کہ وہ اپنے تمام مضموم ارادوں میں کامیاب بھی رہے تھے۔ ہمارے نئے اور پرانے نقادوں کو اس بات کا یقیناً علم ہے کہ ادب ہر جائی ہوتا ہے اور یہی ہرجائیت ادب کی روح کا خاصہ ہے۔ہم آج جس نظریے کو اتنی اہمیت دے رہے ہیں کل اُس کا چلن بازار سے اُٹھ جائے گا اور ایک بار پھر ہمارا واسطہ مصنف اور اُس کے ارادی منشا سے پڑے گا۔وہ دن دور نہیں جب تخلیق کار کی تخلیقات وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنی تازہ کاری کا حسن برقرار رکھیں گی اور ان سے منسلکہ مغربی تنقیدی تصورات اور اصطلاحات کی آب و تاب گم ہو جائے گی۔اُس وقت ہمارے نقاد حضرات کسی نئی بشارت کی تلاش میں نکل کھڑے ہوں گے۔اس ضمن میں لطف الرحمٰن کا پیش کردہ تجزیہ کچھ نئے زاویوں کو ہمارے سامنے لاتا ہے:

'' تیسری دنیا کے لوگوں کو بے معنی ادبی اور نظریاتی مباحث میں اُلجھا کر زندگی کی کڑی سچائیوں کے شعور و احساس سے بے گانہ رکھنے کی سازش عالمی سطح پر رچائی گئی ہے۔اس مقصد کے لیے ادب،فن،اورعلم و دانش کے تعلق سے ہر ملک میں ان کے ایجنٹ دن رات متحرک ہیں۔یہ لوگ سماج میں اہلِ علم اور اور دانشور کی حیثیت سے خود کو قائم کرنے میں ہر طرح کے جوڑ توڑ سے کام لے کر آج کلیدی مقامات پر فروکش ہیں اور پدم شری وغیرہ کے خطابات و اعزازات سے سرفراز ہو چکے ہیں۔یہ نام نہاد دانش ورعملاً ملک دشمن سرگرمیوں میں مصروف ہیں اور ذہنی اور دانشورانہ سطح پر دہشت گردی پھیلا رہے ہیں جو مسلح دہشت گردی سے زیادہ خطرناک ہے۔''(۸)

عالمی ادب کے معمار اپنی روایات اور اُن سے حاصل ہونے والے تجربات کو فوقیت دیتے ہیں اور کسی خاص نظریے یا شخص کو تقدیس کے لبادوں میں لپیٹ کر اُس کی پرستش نہیں کرتے اور جذباتیت سے بچتے بچاتے ادبی سرحدوں کی حفاظت کرتے ہیں۔اس کے برعکس ہمارے ہاں سیاسی اور ادبی مقاصد کے باہمی فرق کو نظر انداز کرتے ہوئے ہر نئی اور علمی

اصطلاح کو بے سوچے سمجھے ادب پر تھوپ دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے آج کا اُردو ادب دنیائے علم کی سماجی اور سائنسی اصطلاحوں اور تحریکوں کی تجربہ گاہ بنتا جا رہا ہے۔ اس امر میں کوئی شبہہ نہیں کہ ادب میں ارتقا اور تبدیلی کا عمل ناگزیر ہے لیکن ہر تبدیلی اپنا ایک فکری جواز بھی رکھتی ہے جس سے آگاہ ہونا نقاد کی اخلاقی اور علمی ذمہ داری ہے۔اُردو ادب میں اس فکری جواز پر شاذ ونادر ہی بات کی جاتی ہے ،کیوں کہ جب مغرب سے ہمیں بنے بنائے اور ڈھلے ڈھلائے تنقیدی سانچے وافر مقدار میں مہیا ہو جاتے ہیں تو پھر ایسی بیگار کا کیا جواز باقی رہتا ہے!اس سہل انگاری نے اُردو ادب میں لا ادبی تحریک کا راستہ ہموار کرنا شروع کر دیا ہے۔

؎ بنے بنائے ہوئے راستوں پہ جا نکلے
یہ ہم سفر مرے کتنے گریز پا نکلے

ادبی تھیوری صرف اُسی صورت میں اپنی فکری ذمہ داری پوری کرے گی جب اس کی اساس ادبی فن پاروں پر اُستوار ہو گی نہ کہ سماجی علوم وفنون کے مسائل و مظاہر اور اُن کے بے صرفہ اطلاقات پر۔ اس وقت معاصر ادب کے حوالے سے ہمارے پاس جدید ادبی تھیوری کے جتنے بھی عملی نمونے موجود ہیں اُن میں من مانی غلط تعبیرات اور نامناسب اطلاقات کی فراوانی نظر آتی ہے۔فن پارہ اگر مشرق کی جانب رواں دواں نظر آتا ہے تو اُس پر کی جانے والی تنقید کا رُخ جنوبی یا اُفقی ہے۔یہ اطلاقات نظری اور تکنیکی یا پھر قواعدی اور لغوی مباحث میں لسانیات کو کچھ ایسے تیکھے انداز سے شامل کر دیتے ہیں کہ وہ ایک ادبی تنقید کا نمونہ کم اور علمی برتری جتانے کا حکم نامہ زیادہ نظر آتا ہے۔

ادبی معاملات میں اُردو والوں کی مغرب زدگی بھی دوہرے معیار کی حامل ہے۔ اس اجمال کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ اُردو والوں کا مغرب والوں کے ساتھ تخلیقی سطح پر مکالمہ نہ ہونے کے برابر ہے۔مغرب کے تخلیقی فن پارے ہمارے ہاں کتنے لوگ پڑھتے ہوں گے؟ اول تو ان فن پاروں کے اُردو تراجم کی رفتار ہی خاصی کم ہے اتنی کم کہ اس کی مدد سے آپ کسی روایت کا کھوج نہیں لگا سکتے (اصل زبان میں مطالعہ کرنے والوں کی تعداد ممکن ہے کہ ایک فیصد تک ہو) اور بیشتر تراجم کا تعلق پرانے یا قدیم متون کے ساتھ ہے اور اُس وقت تک پُلوں کے نیچے سے کتنا پانی گزر چکا ہوتا ہے اُس کا اندازا لگانا کارے دارد۔معاصر مغربی تراجم کا جو حال ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم اُردو والے مغرب کے تخلیقی تجربے میں شامل ہونے سے بوجوہ قاصر ہیں۔ثقافتی بُعد کا مسئلہ اپنی جگہ ایک اٹل حقیقت ہے۔دوسری طرف مغرب میں جیسے ہی ادب یا دیگر علوم وفنون میں اُصول سازی کا عمل شروع ہوتا ہے اور نئے رجحانات پر فکری مباحث چھڑنے لگتے ہیں ہمارے ادیب اور نقاد بھی فوراً اُنھی مسائل پر بولنا شروع کر دیتے ہیں۔ہمارے نقاد جس اندھے اعتماد اور تیقن کے ساتھ ان جدید رویوں پر بولتے ہیں سُن کر تعجب ہوتا ہے کہ مغرب کے وہ مسائل جو ایک خاص صورتِ حال کی پیداوار ہیں اور جن کا ظہور فکری اور تاریخی ارتقا کا مرہونِ منت ہے وہ اچانک راتوں رات ہمارا مسئلہ کیسے بن گئے؟ کیا ہمارا یہ ادبی رویہ کوئی منطقی جواز رکھتا ہے؟ کیا اُردو ادب اب محض اسی قابل رہ گیا ہے کہ ہم مغرب کی ہر فکری تبدیلی کو ہنگامی بنیادوں پر اپنا مسئلہ بنا لیں۔ اگر ہمارے ناقدین اتنے ہی باشعور اور صاحبِ بصیرت ہیں تو اپنی ثقافتی

صورتِ حال کو سمجھ کر اور فکری روایت کو پیشِ نظر رکھ کر خود اُصول سازی کیوں نہیں کرتے؟ ادبی تحریکات، رجحانات اور تجربات کا تعلق کسی ملک یا تہذیب کی مخصوص صورتِ حال سے ہوتا ہے، ایسا نہیں ہوتا کہ فرانس، امریکہ، روس اور انگلستان میں کسی مسئلے پر ایک نظریہ سامنے آیا اور ہمیں یہ احساس ہونے لگے کہ یہ مسئلہ تو ہمارا بھی ہے اور پھر افراتفری کے عالم میں اُس کے اطلاقات کی فکر میں سرگرداں ہو جائیں۔ اگر ہم ایسا سمجھتے ہیں تو اس کا صاف صاف مطلب یہ ہوا کہ ہم نے اُصولِ تطبیق کو کائنات کی آخری صداقت مان کر اصل تحقیق و جستجو سے اپنا پیچھا چھڑا لیا ہے۔ یہ اصولِ تطبیق اصلاً علمِ کلام کی ایک اصطلاح اور حربہ ہے جسے مذہبی معاملات میں برتا جاتا ہے اور عموماً اس کے نتایج علمی حوالے سے ٹھوس نہیں ہوتے کیوں کہ ادھر اُدھر کی تحقیقات کو بروئے کار لا کر کسی مخصوص عقیدے کو عقلی و نقلی دلیل سے مزین کرنے کی سعی کی جاتی ہے۔ مسلم فکر کو اُصول تطبیق کا نقصان یہ ہوا کہ اصل فلسفیانہ اور سائنسی افکار کا بہتا دریا آہستہ آہستہ خشک ہوتا چلا گیا۔ اب یہی حربہ اُردو ادب میں استعمال کیا جا رہا ہے جس کی وجہ سے ہمارے ادب میں اس وقت فکری بحران اور انتشار کی سی کیفیت پیدا ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اس وقت اُردو ادب کے یہی جدید دانشور مغرب کے علمی ادبی خزانوں کو اُن کے اصل پس منظر اور پیش منظر سے کاٹ کر مختلف ادبی اصناف پر چسپاں کرنے میں مصروف ہیں۔ جدید کاروں کا یہ فرقہ خود کو بزعمِ خویش پڑھا لکھا اور روشن خیال سمجھتا ہے اور باقیوں کو قدامت پرست اور کم سواد کہہ کر مطمین ہو جاتا ہے۔

ہر فکر کے باطن میں اُس کا رد بھی پوشیدہ ہوتا ہے۔ میشل فوکو نے ساختیات پر جو ضربِ کاری لگائی اُس کی وجہ سے ساختیات کا اپنے پیروں پر کھڑا رہنا ممکن نہیں رہا۔ فوکو نے انسانی فطرت، سماج، ثقافت اور ادب کی مشترکہ میراث اور باہمی تعلقات کی طرف جو توجہ دلائی اُس کی وجہ سے فکرِ انسانی میں ایک نئی طرز فکر کا اضافہ ہوا ہے۔ اس فکر کی سب سے بڑی دین یہ ہے کہ انسانی فکر شعور کی جادوئی اور موضوعی حد بندیوں سے باہر نکل کر اپنے اردگرد پھیلی محسوس اشیا اور مظاہر کے حوالے سے اپنے مسائل کی تفہیم کی جانب راغب ہوتی جا رہی ہے۔ ادب کو اُس کا جائز مقام دلانے میں بھی فوکو کے افکار توجہ طلب ہیں۔ ادب کی خدمت یہ نہیں ہے کہ اُس پر ادھر اُدھر کے افکار لاد کر اس کی اصل صورت کو مسخ کر دیا جائے اور ادبی اقدار کو دیگر اقداری نظام کے تناظر میں دیکھنے کی روش اپنائی جائے بلکہ ادب صرف اُنہی علوم کی مداخلت برداشت کر سکتا ہے جو اس کی اصلیت کو برقرار رکھتے ہوئے ادب فہمی میں معاونت کریں۔ مغرب پسند نقادوں کو یہ خاطر نشان رہے کہ خود مغرب میں ادبی تھیوری کی حشر سامانیوں کے خلاف بہت کچھ لکھا جا رہا ہے۔ لیکن مقامِ تعجب ہے کہ مغرب میں ادبی تھیوری کی محدودیت اور اس کی اصولی مخالفت کے ضمن میں جو کچھ لکھا گیا ہم اُردو والوں نے اُس سے کچھ زیادہ تعرض نہیں کیا۔

ادبی تنقید کے کچھ حدود و قیود بھی ہیں اور اس کے خاص مقاصد ادب میں صحت مند رجحانات پیدا کرنے کا ایک ذریعہ ہیں۔ ان مقاصد کے حصول کی خاطر تنقید اُن تمام پابندیوں کا پاس لحاظ رکھے گے جو تخلیقی ادب کی جانب سے پیش ہو سکتی ہیں۔ مادر پدر آزاد تنقیدی اُصول اور خود مکتفی متن کی حیلہ گری کے نعرے فکری عدم توازن کا نقشہ سامنے لاتے ہیں۔ تنقید صرف اُسی صورت میں قابل قبول نتائج مہیا کرے گی جب وہ ادب کے بنیادی تقاضوں سے ہم آہنگ ہو گی۔ اجمل کمال کے نزدیک تنقید کا جو جامع اور مفید تصور ہے اُسے عام کرنے کی ضرورت پہلے کی نسبت اب زیادہ

محسوس ہو رہی ہے۔وہ کہتے ہیں:

'' جو تنقیدی تحریر میرے کسی ادبی متن کے احساس یا تاثر میں کوئی اضافہ نہیں کرتی اور انفرادی یا معاشری زندگی سے اُس کے تعلق کے کسی نئے پہلو کا انکشاف نہیں کرتی، اُس کا مجھے کوئی جواز نظر نہیں آتا۔اور کم از کم اُردو میں لکھی جانے والی بیش تر تنقیدی تحریریں مجھے ایسی ہی بے جواز معلوم ہوتی ہیں۔'' (۹)

ادبی تھیوری کے رطب و یابس میں صحت مند تنقید کی رہنمائی کے لیے چند گوہر آب دار بھی موجود ہیں جن سے استفادہ کیا جا رہا ہے اور کیا جانا چاہیے لیکن ادب کے'' بین العلومی مطالعات'' کا نعرہ خطرناک ہے کیوں کہ یہ طریقِ کار بالآخر اُس نقطے پر منتج ہوگا جہاں ادب کا وجود معدوم ہوتے ہوتے دوسرے علوم میں ضم ہو جائے گا۔دنیا کے تمام علوم وفنون اپنی شناخت کو قائم رکھتے ہوئے نت نئے پیراڈئم قبول کرتے ہیں اور ادب کے ساتھ آج کل جو کچھ ہو رہا ہے اس سے یہ تو یہی گمان گزرتا ہے کہ ادب کی منفرد حیثیت کو ختم کرنے کی منظّم کوشش کی جارہی ہے۔خدا کرے کہ یہ گمان غلط ثابت ہو۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر امجد طفیل،'' تھیوری اور ادبی تھیوریز۔۔پرانی مصنوعات، نئے لیبل''، مشمولہ:'' اردو کالم''،شمارہ۲،ء،مدیر عابد سیال، ادارہ تحقیقات اُردو، اسلام آباد،۲۰۱۵ء،ص۵

۲۔ مشتاق صدف،ادبی تھیوری،شعریات اور گوپی چند نارنگ،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی،۲۰۱۴ء،ص۱۴

۳۔ ڈاکٹر امجد طفیل،'' تھیوری اور ادبی تھیوریز۔۔پرانی مصنوعات''، نئے لیبل ،مشمولہ:'' اردو کالم''،شمارہ ۲،اگست ۲۰۱۵ء ادارہ تحقیقات اُردو، اسلام آباد،ص،۵

۴۔ ضمیر علی بدایونی،جدیدیت اور مابعد جدیدیت (ایک ادبی وفلسفیانہ مخاطبہ)،اختر مطبوعات،کراچی،۱۹۹۹ء،ص،۱۴-۱۳

۵۔ ضمیر علی بدایونی،جدیدیت اور مابعد جدیدیت (ایک ادبی وفلسفیانہ مخاطبہ)،اختر مطبوعات،کراچی،۱۹۹۹ء،ص،۱۴-۱۳

۶۔ ضمیر علی بدایونی، مابعد جدیدیت کا دوسرا رُخ،شہرزار،کراچی،۲۰۰۶ء،ص،۱۰۸

۷۔ ضمیر علی بدایونی، مابعد جدیدیت کا دوسرا رُخ،شہرزار،کراچی،۲۰۰۶ء،ص،۱۱

۸۔ لطف الرحمٰن،''مابعد نوآبادیاتی تہذیبی جارحیت''،مشمولہ:سہ ماہی'' ذہن جدید''،شمارہ ۵۲،ستمبر تا فروری،مدیر جمشید جہاں، ذاکر نگر،دہلی،۲۰۰۹ء تا۲۰۰۸ء ص۴۷

۹۔ اجمل کمال،اچھی اُردو بھی کیا بُری شئے ہے،آج کی کتابیں،کراچی،۲۰۱۵ء،ص ۵۷